التفسیر والتعبیر

عزیز زبیدی۔

سُورَۃ بقرۃ

(قسط ۲۳)

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں (کے چلے کا) وعدہ کیا پھر تم ان کے (گئے) پیچھے

مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ

(پرستش کے لیے) بچھڑے کو لے بیٹھے اور تم (آپ اپنے اوپر) ظلم کر رہے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی ہم نے تم سے درگزر کی

لے وَاِذْ وٰعَدْنَا (اور جب ہم نے وعدہ کیا، اور جب ہم نے وقت مقرر کیا، اور جب ہم نے وعدہ کر لیا تھا)

اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان قول و قرار طے پایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ہاں یعنی تنہائیوں میں آکر قیام کریں گے اور حق تعالیٰ انہیں کتاب اور فرقان عطا کریں گے تنہائیوں کو خدا کا دربار قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہاں بہر حال اللہ تعالیٰ ضرور ہوتا ہے، غسل خانہ میں جہاں اور کوئی نہیں ہوتا وہاں بھی کپڑا باندھ کر نہانے کی سفارش کی گئی ہے، کیونکہ اللہ تو بہر حال دیکھتا ہے۔ پھر تنہائیاں کچھ فضا بھی ایسی مہیا کر دیتی ہیں کہ رب کی معیت کا احساس کروٹ لینے لگتا ہے، بشرطیکہ ان تنہائیوں میں کوئی اس احساس اور گھڑیوں کو آواز دے۔ اس کے علاوہ جب کوئی شخص سب دھندے چھوڑ کر رب کے حضور رہ رب کے لیے یکسو ہو جاتا ہے، تو اسے بھی "دربارِ الٰہی میں بندے کی حاضری" تصوّر کی جاتی ہے۔ خواہ وہ بھرے مجمع میں کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ یہاں ستر نقیبار کی ہمراہی میں ہوا۔ پس اس وعدہ میں

اسی قسم کی تنہائی کا ذکر ہے، اور یہ وعدہ گاہ کوہ طورِ سینا کی داہنی جانب کی کوئی چوٹی یا جگہ تھی۔

وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ (پ۱۶۔ طٰہٰ ع۴)

محققین نے طورِ سینا اور اس کے محلِ وقوع کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

سینا کا جزیرہ نما خلیج سویز اور خلیج عقبہ سے گھرا ہوا ہے اور اس کے شمال میں بیابانِ تیہ ہے۔ کبھی افریقہ کو عرب کے شمالی و جنوبی حصہ سے ملائے ہوئے تھا، اس جزیرہ نما میں سینا کا کوہستانی سلسلہ ہے جس میں تین علیحدہ علیحدہ پہاڑ ہیں، اول کوہ سربل جو ۶۷۵۰ فٹ بلند ہے۔ دوسرا ام شمیر ۸۰۰۰ فٹ اور تیسرا کوہ کتھرائن ۸۵۴۰ فٹ بلند ہے۔ اس کی دو چوٹیاں ہیں، شمالی کوہ حورب اور جنوبی کو "جبلِ موسیٰ" کہتے ہیں، قرآن کا طورِ سینا بھی یہی کتھرائن ہے۔

فراعنہ کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اسی کوہِ طور کے دامن میں لا بسایا تھا۔ اور یہیں سے کوہِ طور پر اپنی وعدہ گاہ پر تشریف لے گئے تھے۔

۲؎ موسیٰ۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) آپ کا تفصیلی تذکرہ رکوع کے آخر میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۳؎ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (چالیس راتیں) دوسرے مقام پر اسے ایک ماہ دس دن سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (پ۹۔ اعراف ع۱۷)

کہتے ہیں تیس دن ماہ ذیقعد کے تھے اور پہلا عشرہ ذی الحجہ کا تھا مگر حدیث میں اس کی تفصیل نہیں آئی۔

اس سفر اور ملاقات میں اسرائیلی ستر نقباء اور رہنما بھی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ وعدہ گاہ میں تشریف لے گئے تھے۔ لِّمِيْقَاتِنَا اس کے لیے قرینہ ہے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا (پ۹۔ الاعراف ع۱۹)

چلّے۔ صوفیائے کرام نے اس واقعہ کو اپنے مخصوص "چلّوں" کے لیے بنیاد اور ماخذ قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ بات محلِ نظر ہے، وہاں حضرت موسیٰؑ تنہا نہیں تھے۔ اس کے علاوہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیلئے مسنون چلّہ "اعتکاف" تجویز کیا گیا ہے۔ اس "مسنون چلّہ" کے بجائے صوفیائے کرام کا دوسرے عجمی چلّوں پر مجتمع ہو جانا ہمارے لیے مقامِ حیرت ہے۔

یہ پہلی شرع اس وقت ہمارے لیے قابلِ عمل ہوتی ہے جب اس سلسلے میں ہماری اپنی شریعت خاموش ہو۔ اگر پیش آمدہ صورت کے متعلق ہماری اپنی شریعت نے کوئی مسنون طرزِ عمل خود بھی پیش کیا ہو تو پھر پہلے انبیاء کے شرائع کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

چلے کا یہ دستور جو صوفیائے کرام کے ہاں متداول ہے، اگر کبھی دیکھنے میں آیا ہے تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حد تک اس کا کہیں کہیں مشاہدہ کیا گیا ہے، لیکن غیر نبی کے بارے میں اس قسم کے چلوں کے لیے کسی بھی شریعت نے کوئی سفارش کی ہو، ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ہاں قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کے اس طرزِ عمل کو بدعت سے تعبیر کیا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (پ ۲۷ - حدید ع ۴)

رہبانیت کو انھوں نے خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اسے واجب نہیں کیا تھا، ہاں انھوں نے (یہ سب کچھ) محض اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا تھا سو وہ اس کی (بھی) پوری پوری نگہداشت نہ کر سکے۔

رہبانیت، عبادت میں مبالغہ اور خلوت گزینی کا نام ہے، وھی المبالغة فی العبادة و الریاضة والانقطاع عن الناس (بیضاوی)

قال الرازی: والمراد من الرھبانیة ترھبھم فی الجبال فارین من الفتنة فی الدین مخلصین انفسھم للعبادة متحملین کلفًا زائدة علی العبادات التی کانت واجبة علیھم من الخلوة واللباس الخشن والاعتزال عن النساء والتعبد فی الغیران والکھوف (تفسیر کبیر سورت حدید)

بیضاوی فرماتے ہیں یہ "مجعولات" (ایجاد بندہ، خود ساختہ) کی قسم سے ہے۔

رھبانیة مبتدعة علی انھا من المجعولات (بیضاوی)

دراصل یہ "چلے" دین نافہمی کی دلیل ہے، معاف زندگی ہیں اور رزمگاہِ حیات میں زندگی کو متوازن لے کر چلنے کا نام "دین" ہے، چلے ان سے فرار کی ایک صورت ہے۔ اس لیے ہم ان چلوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ جب ایک کام دین سمجھ کر کر لیا جائے تو اسے نباہ دینا چاہیے، مگر یہ نتیجہ محلِ نظر ہے، یہاں نباہنا تا دینا کہا گیا ہے، اور یہ بات ناپسندیدگی کی علامت ہے مشروعیت کی نہیں۔

تقویم - یوم کے بجائے "لیلة" کو اختیار کرنا اس امر کا غماز ہے کہ شریعت میں معتبر تقویم، تقویم قمری ہے جو چاند کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔

قال الرازی: انما قال اربعین لیلة لان الشهور یبتدأ من اللیالی (تفسیر کبیر)

وقال القرطبی: دلت الآیة علی ان التاریخ یکون باللیالی دون الایام (قرطبی)

خود تاریخ کا مادہ "ارخ" بھی عبرانی وغیرہ سامی زبانوں میں چاند کے ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کو تاریخ کے سلسلے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی شمسی کے مقابلے میں قمری تقویم بالکل قدرتی ہے۔

اسلام سے پہلے مکہ والوں نے "نسئ" (بھلانے، پیچھے ڈال دینے، مونڈ لگانے اور کبیسہ) کا طریقہ رائج کر رکھا تھا، حقیقت میں یہ کبیسہ یا مونڈ لگانے کی صورت نہیں تھی بلکہ اغراض فاسدہ کی بنا پر مثلاً حرمت کے مہینوں (محرم، رجب، ذیقعد، ذی الحجہ) میں نیت خراب ہو جاتی اور چاہتے کہ دنگا فساد ہو اور اتفاق سے وہ مہینہ "حرمت والا" ہوتا جس میں بدامنی جائز نہیں ہوتی تو اس ماہ کو تبدیل کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا ماہ بنا لیتے مثلاً محرم کی جگہ صفر، اس کے بعد پھر محرم کا چکر چلتا۔ قبیلہ تمیم کا سردار جس کا قلمس لقب ہوتا تھا۔ وہ حج کے دنوں میں اس "نسئ" کا اعلان کیا کرتا تھا جمرہ عقبہ کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کرتا تھا (سبائک الذہب)

قرآن کریم نے اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (سورۂ توبہ ع۵) مہینوں کو ہٹا دینا کفر میں اور ترقی کرنا ہے۔ ان کی اسی دھاندلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اور سنہ ۱۰ھ کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس "نسئ" کے خاتمہ کا اعلان فرمایا تھا۔

ان الزمان قد استدار کھیئته یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض (بخاری)

دوسری اس کی شکل کبیسہ کی تھی کہ قمری اور شمسی مہینوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کیا کرتے تھے مگر انتہائی تکلف کے ساتھ۔ بہرحال دس ہجری کے بعد مسلمانوں میں قمری تقویم رائج ہو گئی۔

مالگذاری اور فصلوں کے حساب کتاب کو درست رکھنے کے لیے مسلمانوں نے ایرانی تقویم کو بھی اپنانے کی کوشش کی اور اس میں حسبِ ضرورت اصلاح بھی کرتے رہے۔ ملک شاہ سلجوقی نے بھی ۴۷۱ھ میں اس کی اصلاح کے لیے عمر خیام، ابو المظفر اسفزاری، خواجہ عبدالرحمان خازنی، میمون واسطی، محمد معموری بیہقی اور حکیم ابو العباس سوکری وغیرہ پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کام کیا تھا۔ اس کا نام جلالی تقویم تھا جو تاتاری غارت گروں کے ہاتھ تباہ بھی ہو گئی! ہاں زیچ الغ بیگ اور اس کی شرح مؤلفہ برجندی نے اس کے فارمولیں کا کچھ خلاصہ نقل کر دیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کام کن لائنوں پر

کیا تھا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مسلمان ریاضی دانوں نے زمانۂ جدید کے نازک اور حساس آلوں کے بغیر جو تقویم بنائی تھی وہ جدید ترین تحقیقات سے صرف بارہ سیکنڈ سالانہ مختلف نکلی ہے۔ سیکنڈوں کی کسرات کی اصلاح کے لیے بھی پوپ گریگری کے حکم کے مطابق جو اصلاح کی گئی تھی اس کی رُو سے تین یا سوا تین ہزار سال میں پورے ایک دن کا فرق پڑ جاتا ہے لیکن مسلمانوں نے جو طریقہ ملحوظ رکھا تھا اس کی رُو سے (۳۵) ہزار سال سے بھی کچھ زیادہ عرصہ میں ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔

لہ اَلْعِجْلَ (گائے کا بچھڑا) مصر کے ایک دیوتا کا نام "حورس" تھا، اس کا چہرہ گائے کی شکل کا تھا، سامری نے بنی اسرائیل سے زیورات اور سونا لے کر جو بت بنایا تھا وہ اسی "حورس" کی شکل کا تھا۔ ہندوؤں کی طرح مصری بھی گوسالہ پرست تھے، یہ اسرائیلی بھی ان کی غلامی کی وجہ سے "النَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" ان کے نقش قدم پر چل نکلے اور اس میں اس قدر راسخ ہو رہے کہ جب حضرت موسیٰؑ ان کو بحرِ احمر کے شمالی سرے سے پار لے کر سینا میں پہنچے تو وہاں ایک قوم کو صنم خانوں میں بتوں کے پاس چلّے اور اعتکاف کرتے دیکھا تو تڑپ اٹھے اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی ان کی طرح کا کوئی دیوتا بنا دے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ۭ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ

(پ ۹ - سورۂ اعراف ع ۱۶)

چونکہ ان میں گوسالہ پرستی کے جراثیم ابھی کافی طاقتور تھے اس لیے مصریوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے باوجود اب بھی ان کے دماغ صنم خانے ہی تھے۔ سامری جو ایک شاطر قسم کا سیاسی آدمی بھی تھا اور ذہین قسم کا ہنرمند بھی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری کو غنیمت سمجھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھانے میں کامیاب ہو گیا کہ خدا جانے حضرت موسیٰ کہاں غائب ہو گئے۔ اب وہ واپس آئیں گے بھی یا نہیں، آرام سے ہم بیٹھے تھے وہاں سے لا کر ہمیں یہاں چھوڑ گیا، اب مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ہے، ان کو مایوسی کی ان اتھاہ گہرائیوں میں ڈالنے کے بعد خود کو مرجعِ عقیدت بنانے کی کوشش کی، اوہام پرست لوگوں کو رام کرنے کے لیے سب سے کامیاب حربہ "عجوبہ" کی نمائش ہوتی ہے چنانچہ اس نے بنی اسرائیل سے سونا اور زیورات منگوا کر پگھلائے اور میکانکی طریقے سے بچھڑے کی صورت کا ایک مجسمہ بنایا جس میں جب ہوا یا سورج کی کرنیں داخل ہوتیں تو گائے بچھڑے کی طرح اس سے آواز نکلتی۔ اس عہد میں یہ بات کچھ بڑی بات

نہیں تھی۔ پندرھویں صدی قبل مسیح میں ایمنوتپ سوم کے عہد میں، اس کے میر عمارت نے تھیبس کے کے مغربی میدان میں فرعون کے دو مجسمے بنائے تھے، جن کے پیٹ سے طلوع آفتاب کے وقت آواز نکلتی تھی۔ اسی فارمولا کے مطابق سامری نے بچھڑے کو بنایا تھا۔ بس پھر کیا تھا، اسے دیکھتے ہی وہ سجدے میں گر گئے۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (پ ۱۶۔ طٰہٰ ع)

پھر اس (سامری) نے ان (اسرائیلیوں) کے لیے اس کا ایک بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا (وہ ایسا بُت (تھا) جس کی آواز (بھی) بچھڑے ہی کی تھی، اس پر وہ بول اٹھے (آہا) یہی تو تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا (بھی) سو (افسوس) وہ بھول کر (کوہِ طور پر چلا) گیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا کہ تم ایک سازش کا شکار ہو گئے ہو، خدا تو تمہارا وہی رحمان ہے۔

يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ (پ ۱۶۔ طٰہٰ ع)

بولے: حضرت موسیٰ آئیں گے تو دیکھی جائے گی، صرف آپ کے کہنے سے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (ایضاً)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی اس گمراہی کی اطلاع وہاں کوہِ طور پر ہی مل گئی تھی کہ لیجیے! سامری انھیں لے ڈوبا ہے۔

فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (پ ۱۶۔ طٰہٰ ع)

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے غصے غصے واپس تشریف لائے اور آ کر قوم کو ڈانٹا اور کہا کہ کیا میں نے مقررہ وقت سے زیادہ دیر لگا دی ہے کہ اپنی مرضی کرنے لگ گئے ہو یا ویسے ہی جوتے کھانے کو جی چاہنے لگا تھا۔

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (ایضاً)

وہ بولے! دانستہ اور خوشی سے تو ہم نے ایسا نہیں کیا، قبطیوں کے سونے کے زیورات وغیرہ کا جو بوجھ ہمراہ لائے تھے، ناجائز تھے، انھیں اکٹھا کر کے آگ میں لا پھینکا، اور ہماری طرح سامری نے بھی اس میں لا ڈالا (اسرائیلیات اور مفسرین) دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے زیوروں کے بوجھ سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ لا کر ان کو آگ میں لا ڈالا اور سامری نے بھی لا ڈالا۔ ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں

کہ ہم مصریوں سے فیشن سیکھ کر آئے اور یہی ٹھن کر رہنے لگے۔ مگر اب سمجھے کہ یہ خبط ہی ہے۔ اس لیے جا کر پھینک آئے۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ (طٰہٰ ع۴)

کہنا وہ یہ چاہتے تھے کہ پھر سامری نے اسے آوازیں نکالنے والا بچھڑا بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیا، چنانچہ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں یہی وہ معبود نہ ہو جس کی تلاش میں حضرت موسیٰؑ نکلے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے حضرت ہارونؑ کا محاسبہ کیا: انھوں نے جواب دیا کہ میری نہیں سنتے تھے۔ زیادہ مقابلہ نہ کیا کہ کہیں آپ یہ فرمائیں کہ تم نے قوم کو انتشار اور افتراق کی راہ پر ڈال دیا۔

إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (پ۱۶ ۔ طٰہٰ ع۵)

آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام سے سختی کے ساتھ جو باز پرس فرمائی تھی، اس کے لیے اللہ سے اب اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے معافی کی درخواست کی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (پ۹ ۔ اعراف ع۱۸)

اب سامری کی باری آئی: کیوں جناب یہ کیا قصہ ہے؟

وہ بولا: جناب! آپ کی خاکِ پا کی یہ سب کرامت ہے، یہ وہ بات تھی جو سب کے سمجھنے کی نہیں تھی، ایک مٹھی لے کر میں نے اس مجسمہ میں ڈال دی تو وہ آوازیں دینے لگ گیا۔ اب اگر وہ بچھڑا بول پڑا تو اس میں میرا کیا قصور، اگر لوگ یہ محیر العقول صورت دیکھ کر بے قابو ہو گئے تو اس میں ان کا کیا دوش؟ عوام، عوام ہی ہوتے ہیں، اب اگر وہ سجدہ میں گر گئے تو خدا ہی کے نام پر گرے، انھیں معذور کیوں نہ تصور کیا جائے؟ اس کے معنی خیز الفاظ یہ ہیں۔

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (طٰہٰ)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ عجیب لوگ ہیں کہ اس کی صرف آواز پر مٹے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ نہ تو کوئی جواب دے سکتا ہے اور نہ کوئی نفع و نقصان۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (طٰہٰ ع۴)

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا (اعراف ع۱۸)

اور فرمایا کہ جو اتنی بات بھی نہیں سمجھتے اور اندھے ہو کر ان کی پوجا میں لگ گئے ہیں، ان کی

کی زندگی بہت ہی ذلت کی زندگی گزرے گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُہُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ ذِلَّۃٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (اعراف ع ۱۹)

ہاں جنھوں نے توبہ کرلی، ان کو معاف کردیا جائے گا۔

وَالَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (ایضاً)

جب ان کا کیا ان کے آگے آیا تو بہت پچھتائے اور لگے دعائیں مانگنے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡہِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّہُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ یَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَ یَغۡفِرۡ لَنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (اعراف ع ۱۹)

بچھڑے کے سودائیوں کے علاوہ دو اور طبقے بھی تھے، ایک وہ جنھوں نے ان کو سمجھایا بجھایا، دوسرا وہ جو خاموش تماشائی بنا رہا۔ جو بچھڑے کے سودائی اور پجاری تھے، ان کے لیے تو قتل کی سزا تجویز ہوئی کیونکہ یہ غیر مذہبی تقاضا کے علاوہ ان کی شریعت میں یہ ایک فوجداری جرم بھی تھا، جو رہے تماشائی یا تبلیغ کرنے والے؛ سو ان کو حکم ہوا کہ توبہ کریں اور ان مجرموں کی گردنیں اڑائیں۔

فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰی بَارِئِکُمۡ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (بقرہ ع ۶)

بچھڑے کی پوجا ساری قوم نے نہیں کی تھی بلکہ عامی قسم کے زود اعتقاد لوگوں نے کی تھی۔

اَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا (اعراف ع ۱۹)

سامری سے کہا کہ: اب تم اپنے معبود کا حشر دیکھو اسے راکھ بنا کر سمندر میں بہائے دیتے ہیں۔

وَانۡظُرۡ اِلٰۤی اِلٰـہِکَ الَّذِیۡ ظَلۡتَ عَلَیۡہِ عَاکِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّہٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّہٗ فِی الۡیَمِّ نَسۡفًا (پ ۱۶ - طٰہٰ ع ۵)

۵۔ ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡکُمۡ (پھر ہم نے تم سے درگزر کی) بچھڑے کا سلسلہ دراصل ایک قومی جرم تھا مگر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا کہ جو زود اعتقاد، عجوبہ پسند اور اوہام پرست لوگ براہ راست بچھڑے کی پوجا میں ملوث ہوئے تھے صرف انھیں سزا دی گئی اور باقی جو تماشائی یا وسیع الظرف مگر بے غیرت دانشور تھے انھیں توبہ کرنے پر معاف کردیا۔ الغرض یہاں فرمایا کہ: تم نے گو بڑی نالائقیوں کا مظاہرہ کیا تاہم ہم نے جلینے کی تم کو پھر مہلت دی اور پوری قوم کو ہمیشہ کے لیے ختم نہ کیا۔

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى

تاکہ تم شکر کرو اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو

الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ ـه وَاِذْ قَالَ

کتاب (توراۃ) اور قانونِ فیصل عطا کیا تاکہ تم ہدایت پاؤ اور (وہ وقت بھی یاد کرنا

مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے بھائیو! تم نے بچھڑے (کی پرستش) کر کے اپنے آپ پر (بڑا ہی) ظلم کیا تو

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا

(اب) اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو یعنی اپنوں کو قتل کرو۔

ـه لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (تاکہ تم ہدایت پاؤ) کے معنی یہاں کَے (یعنی تاکہ) کے ہیں۔ (طبری) یعنی کتاب اور فرقان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کرنے سے غرض یہ تھی کہ تم ہدایت پا جاؤ بھٹکے بھٹکے نہ پھرو۔

کتاب سے مراد تورات ہے۔ تورات کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔

اچھے عمل کرنے والوں کے لیے سراپا نعمت ہے۔ اس میں کوئی اغلاق نہیں، کامل تشریح ہے۔

اجمال نہیں تفصیل ہے، سراپا ہدایت، رحمت اور کتاب مبارک ہے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّ رَحْمَةً ..... وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ (پ ۸ - الانعام ع ۱۹)

عقل مندوں کے لیے ایک یادداشت ہے۔

هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (پ ۲۴ - مومن ع ۶)

کتاب تورات بصیرت افروز ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ (پ ۲۰ - القصص ع ۵)

کتاب توراۃ سراپا روشنی ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ (پ ۶ - مائدہ ع ۷)

أَنْفُسَكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۚ فَتَابَ عَلَيْكُمْ

جس نے تم کو پیدا کیا اس کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ چنانچہ (جب تم نے اس کی طرف رجوع کیا تو)

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ

اس نے (بھی) تمہاری توبہ قبول فرمالی، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے

نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ

حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! جب تک ہم خدا کو ظاہر ظہور نہ دیکھ لیں ہم تمہارا یقین ہرگز نہ کریں گے

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ

اس پر تم کو بجلی نے آدبوچا اور تم دیکھا کیے ۔ پھر تمہارے مرے پیچھے ہم نے تم کو جِلا اٹھایا

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

تاکہ تم شکر کرو

یہ احکامِ الٰہی کا مجموعہ ہے۔

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ (پ ۶ ۔ مائدہ ع ۷)

تورات کا دامن تھام کر چلنے والوں کے لیے برکتیں ہی برکتیں ہیں۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (مائدہ ع ۹)

اس کے بغیر ان کی قیمت ایک ٹیڈی پیسہ بھی نہیں ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ (مائدہ ع ۱۰)

اور فرقان سے مراد وہ دینی اور پیغمبرانہ ملکہ اور روشنی ہے جو حامل کتاب کے لیے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بعد کتاب سے منشاءِ الٰہی کے سمجھنے اور اس کی روشنی میں پیش آمدہ حالات کو حل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے فرقان کو حکمت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ تورات کے ذکر کے ساتھ دوسری جگہ فرقان کے بجائے "نور" اور اس کی روشنی میں

مسائل حل کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (پ ۔ مائدہ ع)

ك خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ (تمہارے خالق کے نزدیک یہ تمہارے لیے بہتر ہے) توبہ کے سامان بن جانا، رب کی بڑی عنایت ہوتی ہے، ورنہ آخرت انسان کی سخت بوجھل ہو جائے۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جان ہی تو ایک شے تھی، جو اسے دے دی، تو بہ سے اسے اب کیا ملا؟ اصل بات یہ ہے کہ اگر توبہ نہ ہوتی تو یہ چار روز ممکن ہے کہ آرام سے گزر جاتے لیکن ابدی زندگی داغدار ہو جاتی، اس لیے محدود کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک غیر محدود اور لازوال زندگی کا ان کو تحفظ دیا۔ کیا یہ کچھ کم عنایت ہے۔

ھ اَلتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان) قدر ناشناس لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنے دروازے بند نہیں فرماتا، بلکہ سدا کھلے رکھتا ہے اور ان کے انتظار میں رہتا ہے کہ اگر کوئی اب بھی باز آجائے تو اس کو تھام لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کرم کسی قانونی پابندی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے سراپا رحم و کرم اور فضل کا تقاضا ہے۔

ف حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (تا وقتیکہ ہم ظاہر ظہور خدا کو دیکھ نہ لیں)

حضرت موسیٰؑ نے بھی خدا کو خدا سے دیکھنے کی خواہش کی تھی، اور ان کی قوم نے بھی ان سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر دونوں میں فرق تھا، وہاں بات حسرتِ دید کی تھی اور یہاں ٹھوک بجا کر دیکھنے کی، اس سے حضرت موسیٰؑ سے تو کہا گیا کہ: آپ کا عشق اور حسرتِ دید سلامت، یہ حسرت یہاں نہیں، وہاں پوری ہو گی، لیکن گستاخ اسرائیلیوں سے کہا گیا کہ: خدا کوئی جنسِ دکان نہیں ہے وہ تو جانِ ایمان ہے، تم خدا شناس نہیں ہو، خدا کو تولنے کے مرض میں مبتلا ہو، چنانچہ ان کو اس کی سزا بھی دی گئی۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ: تلاشِ رب کے جذبے میں صادق ہوتے تو میرے بجائے بچھڑے کے آستان پر کیوں جان چھڑکتے، محبوب کا وصال گراں ہو جائے تو عاشقِ صادق کی بے چینیاں اور بڑھ جاتی ہیں ایسا نہیں کہ اب وہ متبادل کسی اور محبوب کی تلاش میں لگ جائے۔

فَقَالُوْا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ الآیۃ (پ ۶ ۔ النساء ع ۲۲)